ڈاکٹر فائزہ زہرا مرزا
ایسوسی ایٹ پروفیسر
شعبۂ فارسی، جامعہ کراچی

تربیت اور کردار سازی فکرِ اقبال کی روشنی میں

ABSTRACT

Training and character building in the light of Iqbal's thoughts
By Dr. Faiza Zahra Mirza,Associate Professor, Dept. of Persian, University of Karachi.

"Training" is an Arabic word which means to take a person out of lowliness and lead him on the path of elevation and perfection and to nurture him properly by taking care of the qualities he needs to move forward. Iqbal is a reformer and educator of the 20th century who has especially played an important role in the education and character building of Muslim children and youth through his Urdu and Persian poetry. In his Persian and Urdu poems, his main addressees are the youth who are the asset and future of the nation and the Muslim world. Iqbal is a moral teacher like Sheikh Sadi and an ambassador of peace and harmony like Khawaja Hafiz Shirazi. The main purpose of his poetry is self-realization, self-improvement and humanization. He is looking for a person who can change the society with his character, speech and thoughts. With the same thought and view, in his poetry, there are themes such as courage, valor, continuous struggle, constant action, justice, equality, kindness, etc.

In this article, considering Iqbal's Urdu and Persian poetry, human training and character building will be highlighted in the light of his thoughts.

Keywords: Iqbal, thoughts, training, character building, Urdu and Persian poetry

مقدمہ

"جس طرح ایک درخت کے پھلنے پھولنے میں اس کا تنا، شاخیں اور پتے کارفرما ہوتے ہیں اسی طرح انسان کی شخصیت جسے اس کا ذاتی کردار یا گلِ سرسبد کہا جاتا ہے، بالکل اس شجر کی مانند ہے جس کا تنا، شاخیں اور پتے درحقیقت تعلیم و تربیت، فکر و خیال

اور اردگرد کے ماحول کی وہ دنیا ہے جو انسانی شخصیت کو پھول کی طرح کھلنے کی توفیق
دیتی ہے اور اس کی معاونت کرتی ہے۔" (۱)

تربیت عربی زبان کا لفظ ہے جو مادہ ''رب'' سے نکلا ہے۔ لغت میں اس کے معنی پرورش، تعلیم وتہذیب، تعلیم و اخلاق کے ہیں۔ کسی چیز کو اس کے ابتدائی مراحل سے انتہا تک پہنچانا اور ان تمام مراحل میں اس کی تمام ضرورتیں پوری کرنا تربیت کہلاتا ہے۔ ''تربیت کا مفہوم کچھ اس طرح ہے:

۱۔ ''انسان کی پوشیدہ اور چھپی ہوئی صلاحیتوں کی تربیت کرنا۔"

۲۔ ''انسان کو پستی سے نکال کر بلندی اور تکامل کی راہ پر گامزن کرنے اور اسے آگے بڑھنے میں جن صفات کی ضرورت ہو ان کی دیکھ بھال کر کے صحیح پروان چڑھانا۔"

۳۔ ''کسی کے اندر مناسب رفتار پیدا کرنے اور اس کو اچھے ہدف تک پہنچانے اور اس کی استعداد کو اجاگر کرنے کے لیے کمالات کی طرف حرکت دینے کا نام تربیت ہے۔'' (۲)

تربیت بغیر تعلیم کے کچھ نہیں۔ اسی لیے تعلیم وتربیت کا بنیادی مفہوم یکساں ہے۔ کسی کو تعلیم دینے کا مطلب اس کی تربیت کرنا اور کسی کی تربیت کرنے کا مطلب اسے تعلیم دینا ہی لیا جاتا ہے۔ تعلیم انسان کا بنیادی حق ہے اور تربیت اسی تعلیم کا بنیادی عنصر ہے۔ اخلاقی تربیت کے بغیر تعلیم غیر موثر ہوگی۔ موجودہ دنیا کی حیرت انگیز ترقی، اسی تعلیم کی رہینِ منت ہے۔ کسی قوم کی روحانی اور تہذیبی قدروں کو نئی نسل تک اس طرح پہنچایا جائے کہ وہ اس کی زندگی کا اہم جز بن جائے تو ایسے اقدام کو ہم ''تعلیم'' کہتے ہیں۔

ہمارے قومی شاعر علامہ محمد اقبال نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بحیثیت ایک معلم کیا اور شعبۂ تعلیم وتدریس سے تقریباً پندرہ سال منسلک رہے۔ ''تعلیم سے اقبال کی نظری وعملی دلچسپی کا ثبوت ۱۹۱۲ء سے یعنی اسی وقت سے ملتا ہے جب نہ تو ابھی ان کا کوئی فلسفۂ حیات مرتب ہوا تھا نہ ''اسرار خودی'' منظرِ عام پر آئی تھی۔" (۳)

"اقبال نے تعلیم وتربیت، علم ودین اور اخلاق وکردار پر جامع خیالات پیش کیے ہیں کیوں کہ تعلیم ہی انسانی زندگی کو نظم وضبط عطا کرتی ہے۔ وہ انسان کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کی تربیت کرتی اور ان کو سنوارتی ہے۔ نیز اخلاقی قدروں کو جلا دینا تعلیم کا اہم فریضہ ہے۔" (۴)

کسی قوم کا مستقبل اس کے نوجوان خصوصاً بچے ہوتے ہیں، اگر کوئی قوم اپنے نظام تعلیم وتربیت میں بچّوں کی تربیت کو مناسب مقام دینے میں کامیاب ہوجائے تو اس کے مستقبل کے محفوظ و مامون ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔

اس مقالے میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ اقبال کی شاعری بے ہدف نہ تھی۔ وہ عصری تقاضوں سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے پیغمبرانہ انداز میں بچّوں، نوجوانوں اور خواتین کی رہنمائی کی ہے اور ان کی فکری، اخلاقی اور روحانی

تربیت اور بالیدگی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔" ۱۹۱۵ء میں جب اسرار خودی اور ۱۹۱۸ء میں رموزِ بیخودی کی اشاعت کے ذریعے اقبال کا فلسفۂ خودی یا پیغامِ حیات منظرِ عام پر آیا تو انفرادی اور اجتماعی تربیت کے سلسلے میں ان کے فکری پہلو بھی سامنے آئے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تعلیم کی بلندترین سطح ان کی نظر میں کیا ہے اور اس سطح تک پہنچنے کے لیے فرد اور جماعت کو کیا کچھ کرنا چاہیے۔" (۵)

بچّوں کی تعلیم و تربیت اور فکر اقبال

علامہ اقبال کی شاعری عالمی معیار اور آفاقی افکار کی حامل ہے۔ ان کی شاعری بچّوں کے لیے تعلیمات سے خالی نہیں اور نئی نسل سے وابستگی اور ان کی تربیت کے حوالے سے ان کی شدّت احساس کی مظہر ہے۔ بچّوں کی نفسیات اور ان کی رہنمائی کے لیے کچھ لکھنا آسان کام نہیں۔ اقبال کی خوش بختی ہے کہ ان کے ماحول، والدین، اساتذہ کرام اور عزیز و اقارب نے ان کی اخلاقی تربیت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ''ان کی ابتدائی تعلیم سنہرے دور کی رہینِ منّت ہے۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل کے شاعر ہیں۔ وہ زندگی کے ارتقا کو ایک پودے کی نشوونما سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کے خیال میں بچّہ ہماری معاشرتی زندگی کی نرسری ہیں۔(۶)

تربیت اور کردار سازی ماں کی گود سے شروع ہوتی ہے اور تعلیمی ادارے بھی مادرِ علمی ہیں جو اس کردار سازی کو تقویت بخشتے ہیں۔ اقبال آنے والے کل کو منوّر اور کامیاب دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ بانگِ درا کی ابتدائی نظموں میں اقبال نے خود کو بچّوں کی رہنمائی کے لیے وقف کر دیا ہے اور ان کو سیدھی، سچّی، تعمیری اور فکری راہ دکھانے کے لیے سادہ اسلوب اپنایا ہے۔

''اقبال نے مخزن، جنوری ۱۹۰۲ء میں بچّوں کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے ایک مفصل مضمون لکھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: ہمارا پرانا طریقۂ تعلیم بچّوں کے قوائے عقلیہ و واہمہ کے مدارج نمو کو ملحوظ نہیں رکھتا اور یہ تعلیمی نقص بڑی عمر میں اور بھی وضاحت سے دکھائی دیتا ہے۔ لہٰذا بچّوں کی ابتدائی تعلیم میں خاص اصولوں کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے تاکہ انھیں اپنے فرائض سے پوری پوری آگاہی ہو اور وہ اپنے آپ کو اُس عظیم الشان درخت کی ایک شاخ محسوس کریں جس کی جڑ تو زمین میں ہے مگر اس کی شاخیں آسمان کے دامن کو چھوتی ہیں۔ جو لوگ بچّوں کی تعلیم و تربیت کے صحیح اور علمی اصولوں کو مدنظر نہیں رکھتے وہ اپنی نادانی سے سوسائٹی کے حقوق پر ایک ظالمانہ دست درازی کرتے ہیں، جس کا نتیجہ تمام افرادِ سوسائٹی کے لیے بے حد مضر ہوتا ہے۔" (۷)

بقول صائب تبریزی:

''چون گذارد خشت اول بر زمین معمار کج
گر رساند بر فلک، باشد همان دیوار کج" (۸)

بچّوں اور نوجوانوں کے لیے اقبال کے اشعار کی تقسیم بندی کی جاسکتی ہے جیسے تاریخی حکایات، جانوروں کے زبانی پند و اندرز، فلسفی حکایات، ظریفانہ اشعار، مثالی کرداروں کی حکایات، ملی نغمے اور مناجات وغیرہ۔

بچّوں کو قصے کہانیوں کی صورت میں بتائی جانے والی باتیں ان پر زیادہ اثرانداز ہوتی ہیں اور ان کی دلچسپی کا باعث بھی رہتی ہیں۔ اقبال نے حیوانوں اور حشرات کی زبانی پند و اندرز کا سلسلہ شروع کیا۔ انگریزی میں ایسی نظموں کو (Fable) کہا جاتا ہے جیسے:

ایک مکڑا اور مکھی

''اقبال نے یہ نظم یورپی شاعرہ میری ہاوٹ (Mary Howitt) کی نظم (The Spider and the Fly) سے اخذ کی ہے۔'' (۹) اس نظم میں اقبال نے بچّوں کو نصیحت کی ہے کہ وہ دوسروں کی میٹھی، تعریفی، چکنی چپڑی باتوں میں نہ آئیں۔ دنیا میں چاپلوس لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ ''آج ہم جس عہد سے گزر رہے ہیں اس میں بچّوں کی حفاظت بہت ضروری ہے۔'' (۱۰)

ایک پہاڑ اور گلہری

''یہ نظم اقبال نے امریکی دانشور، شاعر و ادیب، آر۔ ڈبلیو۔ ایمرسن (R.W.Emerson) کے کلام (The mountain and the squirrel) سے حاصل کی۔'' (۱۱) اس نظم میں اقبال بچّوں کو ایک مکالمے کی صورت میں یہ پیغام دے رہے ہیں کہ کائنات کی کوئی چیز بے کار نہیں ہے۔ ہر چیز کی اہمیت ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ انسان کے لیے وقف ہے۔ ہر چیز اللہ کا شاہکار ہے۔ اللہ نے سب کو خوبیوں سے سرفراز کیا ہے۔ یہ ہماری سوچ ہے کہ ہم انسانوں میں تفریق رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں'' (۱۲)

ایک گائے اور بکری

گائے اور بکری کے مکالمے سے بچّوں کو نصیحت کی ہے کہ دوسروں کا گلہ نہ کیا جائے بلکہ احسان کرنے والوں کے ساتھ مہربانی اور حسن سلوک کرنا چاہیے۔ ہمیں ہر وقت اللہ تعالیٰ اور اس کی مخلوق کی شکر گزاری کرنی چاہیے۔

''ہم پہ احسان ہے بڑا اس کا
ہم کو زیبا نہیں گلا اس کا''

قدر آرام کی اگر سمجھو
آدمی کا کبھی گلا نہ کرو"(۱۳)

نظم ہمدردی

اقبال نے ایک بلبل اور جگنو کے مکالمے سے ہمدردی کے جذبات و احساسات پیش کیے ہیں۔ یہ نظم اقبال نے مشہور برطانوی شاعر ولیم کوپر کے خیالات سے اخذ کی ہے۔ وہ اس نظم کے ذریعے بچّوں کو خدمت خلق اور ہمدردی کا پیغام دے رہے ہیں۔ یہ پیغام تو درواقع اسلام نے ہمیں دیا ہے اور اسلام ہمیں اُخوّت، مروّت، احترام انسانیت، اخلاقی اقدار اور رحمدلی کا درس دیتا ہے کہ دنیا میں وہی لوگ عظیم ہیں جو دوسروں کا ساتھ دیتے ہیں۔ نظم کا اخلاقی درس یہ ہے کہ:

''ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے"(۱۴)

پرندے کی فریاد

اقبال نے یہ نظم بچّوں کو آزادی کا درس دینے کے لیے لکھی۔ اس نظم میں آزادی جیسی عظیم نعمت اور اس کے برعکس قید و بند کی صعوبتیں اور محکومیت کی اذیت کی ترجمانی کی ہے۔ پرندہ قید و بند کی فریاد کرتے ہوئے کہتا ہے:

''جب سے چمن چُھٹا ہے یہ حال ہوگیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے"
''گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دُکھّے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے"
''آزاد مجھ کو کردے، او قید کرنے والے
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے"(۱۵)

ایک پرندہ اور جگنو

اقبال اس نظم میں بچّوں کو یہ تربیت دیتے ہیں کہ خالقِ کائنات نے ہر چیز میں حکمت و دانائی کے نگینے چھپا رکھے ہیں۔ بدصورتی اور حسن دونوں کائنات کا نکھار ہیں۔ کائنات کی ہر چیز میں نشانیاں ہیں۔ سب کچھ حکم الٰہی کے گرد گھومتا ہے۔ جہاں پھول ہوں، وہیں کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ کانٹے نہ ہوں تو پھول سہارے کے بغیر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتا۔ دنیا کا پورا

ماحول، اتحاد، اتفاق، خلوص، محبّت، محفل آرائی، خوشی، غمی، رنج و الم، نشاط اور امتحان میں گھرا ہوا ہے۔ منزل مراد کا حصول رکاوٹوں کو عبور کرنے سے ہی ممکن ہے۔ حضرت محمد مصطفی ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے اور جو شخص حکمِ الٰہی کے سامنے سرنگوں ہوجاتا ہے تو کائنات اس کے سامنے جھک جاتی ہے۔ اقبال نے بچّوں اور بڑوں کو اس نظم میں یہ درس دیا ہے کہ غم اور خوشی کی حالت میں رب کائنات سے مایوس نہ ہوں۔ جگنو پرندے سے کہتا ہے:

''تجھے جس نے چہک، گل کو مہک دی
اسی اللہ نے مجھ کو چمک دی''
''لباس نور میں مستور ہوں میں
پتنگوں کے جہاں کا طور ہوں میں''
''چہک تیری بہشت گوش اگر ہے
چمک میری بھی فردوس نظر ہے''
''پروں کو میرے قدرت نے ضیا دی
تجھے اس نے صدائے دل ربا دی''
''مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز
جہاں میں ساز کا ہے ہم نشیں سوز''
''قیام بزم ہستی ہے انھی سے
ظہور اوج و پستی ہے انھی سے''
''ہم آہنگی سے ہے محفل جہاں کی
اسی سے ہے بہار اس بوستاں کی'' (۱۶)

بچّے کی دعا

اقبال کی لکھی گئی نظم ''بچے کی دعا'' بچّوں کے لیے ادب میں مقبول ترین درجہ رکھتی ہے۔ تعلیمی اداروں میں اسی نظم سے تدریسی کام کا آغاز ہوتا تھا۔ اس نظم کے ذریعے سب سے پہلے بچّوں میں دینی حس بیدار کرنا منظور تھا کہ مسلمانوں کے لیے دعا کی کتنی اہمیت ہے اور انسان کو اپنی ہدایت اور کامرانی کے لیے اپنے خالق حقیقی سے رجوع کرتے رہنا چاہیے۔ اقبال اس دعا کے ذریعے بچّوں کو عمدگی سے یہ درس دیتے ہیں کہ ہمیں اپنی ذات سے بالاتر ہوکر دوسروں کے کام آنا چاہیے۔ اعلیٰ اوصاف اُسی صورت میں ظاہر ہوسکتے ہیں جب ہم دکھی انسانیت کی خدمت کریں گے۔ یہ کام گفتار سے نہیں کردار سے حاصل

ہوتا ہے۔علم سے محبّت رکھنا،غریبوں کی حمایت کرنا، دردمندوں سے محبّت کرنا اس دعا کا بنیادی پیغام ہے۔آخر میں اللہ سے نیک راہ پر گامزن رہنے اور برائی اور بے راہ روی سے بچنے کی دعا کی گئی ہے۔اس نظم کے ذریعے بچّوں کو خشوع وخضوع کے ساتھ دعا مانگنے کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔

''لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنّا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری''
''دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہوجائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہوجائے''
''ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت''
''زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبّت یارب''
''ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
دردمندوں سے، ضعیفوں سے محبّت کرنا''
''مرے اللہ! برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو''(۱۷)

نوجوانوں کی تربیت اور فکرِ اقبال

اقبال کی شاعری تین واضح ادوار میں منقسم ہے۔ان کی جوانی کی شاعری، ان کی پختہ سالی کی شاعری اور آخر میں ان کے بڑھاپے کی شاعری۔لیکن یہ ایک عجیب وغریب اور حیرت انگیز بات ہے کہ ان تینوں ادوار میں ان کا مخاطب صرف نوجوان ہے۔''(۱۸) اقبال کے مخاطب صرف ان کے عہد کے نوجوان نہ تھے بلکہ انھوں نے ہر عہد کے مسلم نوجوانوں کو خطاب کیا ہے۔ بانگِ درا میں اقبال کی نظم ''خطاب بہ جوانانِ اسلام'' ان کی معروف نظم ہے،جس میں وہ بہ صورت مستقیم نوجوانوں سے مخاطب ہیں۔تربیت کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ تربیت کرنے والا تربیت پانے والے کی کمزوریوں اور اس کی خامیوں کو اس کے ماضی اور حال کا مکمل جائزہ لے کر اُسے بہتر مستقبل کی طرف رہنمائی کرے اور یہی کام اقبال نے اس نظم میں کیا ہے۔وہ پہلے مسلمان نوجوانوں کو ان کے اسلاف کے روشن ماضی، ان کی تمدن آفرینی اور جہانداری کے متعلق احساس دلاتے ہیں جیسا کہ وہ کہتے ہیں:

''تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبّت میں
کُچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا''
''تمدن آفریں، خلاقِ آئینِ جہاں داری
وہ صحرائے عرب یعنی شتربانوں کا گہوارا''
''غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہاں بان و جہاں آرا''
''غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را''(۱۹)

اقبال اس نظم میں مسلمان نوجوانوں کو مخاطب کر کے انھیں کہتے ہیں کہ ہم نے جو اسلاف کی میراث پائی تھی اسے گنوا دیا ہے اور تقدیر نے بھی ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ ہم اونچائی سے زمین پر گرے ہیں:

''گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا''(۲۰)

آخر میں کہتے ہیں کہ آج ہم اپنے اسلاف کی کتابیں اور ان کا علمی ذخیرہ بھی کھو چکے ہیں اور یہ علمی ذخائر ہماری بےتوجہی اور عدم رغبت کی وجہ سے ایشیا سے نکل کر یورپ کے کتب خانوں کی زینت بن چکے ہیں۔

''مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارا''(۲۱)

لیکن اس نظم کے آخری شعر میں انھوں نے غنی کاشمیری کے شعر کو نوجوانوں کے لیے بطور نوید سحری پیش کیا ہے جس میں انھیں مستقبل کی امید دی ہے کہ جس طرح یوسف علیہ السلام نے معجزے سے حضرت زلیخا کی نابین آنکھوں کو نور کی روشنی سے منور کر دیا اسی طرح جوانانِ اسلام بھی اپنے فن اور صلاحیتوں سے معجزاتی طور پر اس قوم کے مستقبل کو روشن و تاباں کر دیں گے۔

اقبال کا فلسفۂ خودی اور بیخودی دونوں انسانی تربیت، خودشناسی، خودشعوری یا خود آگاہی کی بہترین مثال ہیں۔ انھیں ایک ایسے انسان کی تلاش ہے جو اپنے کردار، گفتار اور افکار سے زمانے کو بدل دے۔ اسرار و رموز کا منظوم ترجمہ ''ترجمانِ اَسرار'' کے نام سے جسٹس ایس اے رحمان مرحوم نے کیا ہے۔''(۲۲)

اقبال کے افکار میں خودی سے مراد وہ شعور ہے جو خودشناس اور خودآگاہ ہو اور اپنی ذات اور اپنے مقاصد کا احساس یا شعور رکھتا ہو۔ حیات و کائنات کے تسلسل و استحکام کا انحصار دراصل خودی کے استحکام پر ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ عالَم

ِ موجودات خودی کے آثار میں سے ہے۔تم جو کچھ یہاں دیکھ رہے ہو اس کا تعلّق خودی کے اسرار میں سے ہے۔ جب خودی نے اپنے آپ کو بیدار کیا تو اس نے عالَمِ کبریائی کو آشکار کر دیا۔

''پیکرِ ہستی ز آثار خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است''
''خویشتن را چون خودی بیدار کرد
آشکارا عالمِ پندار کرد''(۲۳)

اقبال کے مطابق خودی نت نئے مقاصد کی تکمیل و آرزو سے جنم لیتی ہے۔ زندگی کا دوام آرزو سے ہے۔ اس (زندگی) کے قافلے کی گھنٹی آرزو ہی سے وجود پذیر ہے۔ زندگی تلاش وجستجو میں پوشیدہ ہے۔ اس کی اساس آرزو میں پوشیدہ ہے۔تم اپنے دل میں آرزو قائم رکھو تا کہ کہیں تیرا یہ جسم مزار کی صورت اختیار نہ کر جائے۔ آرزو خودی کے ہنگامے کو آراستہ کرنے والی اور خودی کے سمندر کی بے قرار موج ہے۔ آرزو، مقاصد کے شکار کو پھانسنے والی کمند ہے۔ وہ دفترِ افعال کی شیرازہ بند ہے۔

''زندگانی را بقا از مدعا است
کاروانش را درا از مدعا است''
''زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است''
''آرزو را در دلِ خود زندہ دار
تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار''
''آرزو ہنگامہ آرای خودی
موجِ بیتابی ز دریای خودی''(۲۴)

اگر آرزو نہ ہو تو ایک زندہ انسان بھی مردہ بن جاتا ہے۔تمنّاؤں کی نفی زندہ انسان کو مردہ کر دیتی ہے۔ کم حرارت شعلے کو بجھا دیتی ہے۔

''زندہ را نفی تمنّا مُردہ کرد
شعلہ را نقصانِ سُوز اَفسُردہ کرد''(۲۵)

یہی خودی عشق و محبّت سے مستحکم ہوتی ہے۔ اقبال عشق کو نور کا وہ نقطہ سمجھتے ہیں جس کا نام خودی ہے۔ یہ خودی ہمارے باطن میں زندگی کی چنگاری ہے۔ خودی محبّت کی بدولت زیادہ دیر تک رہنے والی، زیادہ زندہ، زیادہ جلانے والی اور

زیادہ چمکدار بن جاتی ہے۔ خودی کی فطرت عشق کی بدولت آتش اندوزی کا کام لیتی ہے اور عشق ہی سے دنیا کو روشن اور منور کرنے کا عمل سیکھتی ہے۔

''نقطہ نوری کہ نامِ او خودی است
زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است''
''از محبّت می¬شود پائندہ تر
زندہ تر، سوزندہ تر، تابندہ تر''
''فطرتِ او آتش اندوزد ز عشق
عالم افروزی بیاموزد ز عشق''(۲۶)

اقبال خودی کی استواری کے لیے راہ محبّت میں ایک مُرشدِ کامل کی ضرورت لازمی سمجھتے ہیں، جو اُسوۂ رسولؐ کا پابند اور مقامِ مصطفیٰؐ کا شناسا ہو۔ اس لیے کہ آنحضرت کی زندگی اور ان کا لایا ہوا دین ہی بنی نوع انسان کے لیے مستقل بشارت ہے۔ وہ اس بات کی ترغیب دلاتے ہیں کہ انسان مشت ِگل سے کیمیا تلاش کریں اور کسی کامل کے آستانے پر بوسہ دے۔ کیوں کہ حضورؐ کے عشق سے دل توانا ہوتا ہے اور خاک بھی ثریا کی ہم پلہ ہوجاتی ہے۔ نجد کی سرزمین ان حضور اکرم ﷺ کے فیض سے حرکت پذیر ہوگئی۔ وہ سرزمین وجد میں آئی اور افلاک پر پہنچ گئی۔ حضرت محمد مصطفی ﷺ کا مقام مسلمان کے دل میں ہے اور ہم مسلمانوں کی عزت و آبرو حضورؐ کے مبارک نام کے طفیل ہے۔

''کیمیا پیدا کن از مُشتِ گلی
بوسہ زن بر آستانِ کاملی''
''دل ز عشقِ او توانا می شود
خاک ہمدوشِ ثریا می شود''
''خاکِ نجد از فیضِ او چالاک شد
آمد اندر وجد و بر افلاک شد''
''در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰؐ است
آبروی ما ز نام مصطفیٰؐ است''(۲۷)

بعد کے عنوانات کے تحت اقبال نے امّت مسلمہ کی بڑی خوب صورت انداز میں تربیت کرتے ہوئے انھیں یہ بات سمجھائی ہے کہ ذاتی غرض اور احتیاج اور دنیاوی حرص و ہوس کی خاطر، کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے یا گدائی کرنے سے خودی ضعیف اور کمزور ہوجاتی ہے اور اگر یہی خودی اعلیٰ مقصد کی محبّت سے سرشار ہو تو کار جہاں بانی و جہاں گیری کے مستحق

ٹھہرتی ہے اور اس میں پیغمبرانہ صفات پیدا ہوجاتی ہیں اور جب خودی، محبّت کے نتیجے میں مضبوط اور قوی ہوجاتی ہے تو اس کی قوّت اور طاقت کائنات پر حکمرانی کرنے لگتی ہے۔ خودی کا پنجہ حق کا پنجہ بن جاتا ہے۔ اس کی اُنگلی سے چاند شَق ہوجاتا ہے۔

''از محبّت چون خودی محکم شود
قوّتش فرماندۂ عالم شود''
''پنجۂ او پنجۂ حق می شود
ماہ از انگشت او شق می شود''(۲۸)

اقبال نے اسی مثنوی میں خودی کی تربیت کے بھی تین مراحل بیان کیے ہیں۔ پہلا اطاعت، دوسرا ضبطِ نفس اور تیسرا نیابتِ الٰہی۔

اطاعت

اطاعت کے لیے کہتے ہیں کہ اے غافل تم اطاعت خداوندی کی کوشش کرو، جبر ہی سے اختیار پیدا ہوتا ہے۔ ایک نا اہل اطاعت کے طفیل ایک اہل بن جاتا ہے۔ آئین کی سختی کا شکوہ نہ کرو۔ حضورؐ کے مقرر کردہ آئین (شریعت) کے دائرے سے باہر مت نکلو۔

''در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار''
''ناکس از فرمان پذیری کَس شود
آتش ار باشد ز طغیان خَس شود''
''شکوہ سنجِ سختیِ آئین مشو
از حدودِ مصطفیؐ بیرون مرو''(۲۹)

ضبطِ نفس

اقبال نے نفس کو خُود پَرور اونٹ سے تشبیہ دی ہے اور اسے خود پرست و خودسوار کہا ہے۔ دنیاوی محبّت اور مال و دولت انسان کے ایمان کو ضعیف کر دیتی ہے۔ لہٰذا اقبال یہ تلقین کرتے ہیں کہ جب تک تمھارے ہاتھ میں لا اِلٰہ کی عصا موجود ہے تم خوف کے ہر طلسم کو توڑ سکتے ہو۔ مرد بنو اور نفس کی مہار کو اپنے قابو میں کرو تا کہ اگر تم کم ارزش ہو تو ضبطِ نفس سے قیمتی گوہر بن جاؤ گے۔

''نفس تو مثل شُتر خود پرور است
خود پرست و خودسوار و خودسَر است''
''مرد شو آور زمامِ او بہ کف
تا شوی گوھر اگر باشی خَزف''
''حُبِّ مال و دولت و حُبِّ وطن
حُبِّ خویش و اقربا و حُبِّ زَن''
''تا عصای لاالٰہ داری بہ دست
ھر طلسمِ خوف را خواھی شکست''(۳۰)

نیابتِ الٰہی

اگر کسی فرد کی خودی اطاعت وضبطِ نفس کے مرحلوں سے کامیاب گزر جائے تو نیابتِ الٰہی کے اُس اعلیٰ منصب پر فائز ہوجاتی ہے جو تخلیقِ انسانی کا مقصدِ خاص ہے اور جس کے حصول کے لیے انسان روزِ اوّل سے سرگرمِ عمل اور مزاحمتوں سے برسرِپیکار رہے۔اقبال کی نظر میں دنیا میں اللہ کا نائب بننا اچھی بات ہے۔کائنات پر حکمرانی کرنا اچھی بات ہے۔ان کے نزدیک خدا کا نائب، دنیا کی روح کی مانند ہے اور اس کا وجود اسمِ اعظم کا پرتو ہے۔

''نائبِ حق در جہان بودن خوش است
بر عناصر حکمران بودن خوش است''
''نائبِ حق ھمچو جانِ عالم است
ھستیِ او ظلِّ اسمِ اَعظم است''(۳۱)

اقبال نے مثنوی خودی میں حضرت علیؓ کی سیرت کے بعض پہلوؤں کا ذکر کیا ہے جو عشقِ الٰہی، عشقِ مصطفوی، شجاعت اور خود آگاہی کا کامل نمونہ اور شاہکار ہیں۔ اس کے بعد ''سید علی ہجویری''، ''ایک پرندے کی تشنہ لبی''، ''الماس و زغال'' اور ''شیخ و برہمن کی حکایات'' کے ذریعے یہی نکتہ سمجھایا ہے کہ خودی کیا ہے اور پائیدار و لازوال ہو کر وہ کس کس طرح کے کارہائے نمایاں انجام دیتی ہے۔ جب خودی محکم ہو جاتی ہے تو اس قوت کی بدولت اگر انسان چاہے تو دنیا کو درہم برہم کرسکتا ہے۔اگر انسان فنا کا طالب ہے تو اسے اپنی ذات سے آزاد ہونا ہوگا اور اگر اسے دوام کی خواہش ہے تو پھر اسے اپنی ذات میں آباد ہونا پڑے گا۔خودی کے بارے میں غور وفکر کرنا چاہیے اور میدانِ عمل کا جواں مرد بننا چاہیے۔اس طرح انسان مردِ حق بن کر صاحبِ اسرار ہوجائے گا۔

''خویش را چون از خودی محکم کنی
تو اگر خواهی جہان برہم کنی''
''گر فنا خواهی ز خود آزاد شو
گر بقا خواهی بہ خود آباد شو''
''از خودی اندیش و مردِ کار شو
مردِ حق شو حاملِ اَسرار شو''(۳۲)

آخر میں اقبال نے بڑی دلسوزی کے ساتھ یہ دعا مانگی ہے کہ کاش لوگ اس کے درد و کرب کو سمجھ سکیں اور اس کی تنہائی کو اپنی ہم نوائی سے انجمن بنالیں:

''من کہ بہر دیگران سوزم چو شمع
بزمِ خود را گریہ آموزم چو شمع''
''شمع را تنہا تپیدن سہل نیست
آہ! یک پروانۂ من اہل نیست''
''انتظارِ غمگساری تا کجا
جستجوی رازداری تا کجا''
''من مثالِ لالۂ صحراستم
درمیانِ محفلی تنہاستم''
''خواهم از لطفِ تو یادِ همدمی
از رموزِ فطرتِ من محرمی''(۳۳)

(ترجمہ: میں جو دوسروں کے لیے شمع کی مانند جل رہا ہوں، اپنی بزم یعنی ملّت کو شمع کی صورت رونا سکھا رہا ہوں، شمع کے لیے اکیلے جلنا آسان نہیں، افسوس کہ میرا ایک بھی پروانہ یعنی فردِ ملّت اہل نہیں ہے۔ کسی شریکِ غم کا انتظار کب تک کیا جائے، کب تک کسی رازدار کی تلاش کی جائے۔ میں صحرا کے گُلِ لالہ کی مانند تنہا ہوں۔ میں محفل میں ہوتے ہوئے بھی تنہا ہوں۔ میں تیرے لطف و کرم سے ایک ایسے رفیق وغم گسار کا طالب ہوں جو میری فطرت کی حقیقتوں سے پوری طرح واقف ہو۔)

اقبال کی مثنوی رموزِ بیخودی دراصل مثنوی خودی کا تتمہ ہے۔ اسرارِ خودی میں ان اصول وضوابط کی نشاندہی کی گئی ہے جو انفرادی خودی کی نشوونما اور تعمیر کے لیے ضروری ہیں اور جن کے اپنانے سے فرد کی زندگی، ارتقائی منزلوں سے بہ آسانی

گزر کر نیابتِ الٰہی کے منصب تک پہنچ سکتی ہے۔ مثنوی رموزِ بیخودی میں فرد سے آگے بڑھ کر پوری ملّت یا قوم کی خودی کی تربیت و ارتقا اور تسلسل و استحکام کی راہیں دکھائی گئی ہیں۔ فرد اور ملّت کے باہمی رشتوں کی اہمیت اور ان کی استواری کے رہنما اصولوں پر بحث کی گئی ہے۔ اقبال کا اس سلسلے میں بڑا مشہور اردو شعر بھی ہے:

''فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں''(۳۴)

اقبال نے مغرب کی قومیت پرستی کے خلاف علَمِ جہاد بلند کر کے یہ بات واضح کی کہ اگر کوئی فرد کمال کے درجے تک پہنچنا چاہے تو اسے کمال کی ارتقائی منزلوں کو طے کرنے کے لیے ایک اچھے معاشرے، ایک باشعور، خوددار اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں پر مبنی ملّت کی ضرورت ہوگی اور یہ ملّت اقبال کے نزدیک ملّتِ اسلامیہ ہے جو محض کسی تخیل یا نظریے کا نام نہیں بلکہ مکمل اور ہر طرح قابلِ عمل فلسفۂ حیات ہے۔ فرد اور مُلک کے ربط کے قانون کو اقبال بے خودی کہتے ہیں:

''فرد را ربطِ جماعت رحمت است
جوہرِ او را کمال از ملّت است''
''تا توانی با جماعت یار باش
رونقِ ہنگامۂ احرار باش
''فرد و قوم آئینۂ یک دیگرند
سِلک و گوہر کہکشان و اخترند''(۳۵)

(ترجمہ: ایک فرد کے لیے جماعت سے اس کا تعلق اور وابستگی باعثِ رحمت ہے۔ اس کی تمام خوبیوں کو ملّت ہی کی بدولت کمال حاصل ہوتا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے خود کو اپنی جماعت (ملّت) سے وابستہ رکھ اور یوں آزاد لوگوں کے ہنگامے کی رونق بن جا۔ فرد اور قوم ایک دوسرے کا آئینہ ہیں۔ وہ گویا موتیوں کی لڑی، موتی، کہکشاں اور ستارہ ہیں۔)

اس ملّت کی تربیت و تکمیل نبوت کی رہبری میں ہوتی ہے۔ نبیؐ اپنی تعلیمات سے لوگوں کو تازہ دم کر دیتا ہے اور زندگی کو بامقصد بنا دیتا ہے۔ ایک حقیر سا ذرہ اس سے روشنی حاصل کرتا ہے۔ ہر اثاثہ اس سے ایک نئی قیمت پاتا ہے۔ وہ نبیؐ ایک ہی پھونک سے سینکڑوں قالب زندہ کر دیتا ہے۔ وہ محفل کو ایک ہی ساغر سے رنگین کر دیتا ہے

''ذرۂ بی مایہ ضَو گیرد ازو
ر متاعی اَرجِ نو گیرد ازو''
''زندہ از یک دم دو صد پیکر کند
محفلی رنگین ز یک ساغر کند''(۳۶)

اس ملّتِ اسلامیہ کا اساسی رکن عقیدۂ توحید ہے۔ یاس وحزن اور خوف، حیاتِ ملی کے لیے مہلک امراض ہیں اور صرف توحید ہی ان کا ازالہ کرسکتی ہے۔ اگر تیرا ایمان خدا پر ہے تو غم سے آزاد ہوجا اور کم وبیش (دنیا) کے خیال سے خود کو آزاد رکھ۔ جس کسی نے مصطفیٰؐ کی رمز کو سمجھ لیا ہے، اس نے خوف میں چھپے ہوئے شرک کو دیکھ لیا ہے۔

''گر خدا داری ز غم آزاد شو
از خیالِ بیش و کم آزاد شو''
''ہر کہ رمز مصطفیٰؐ فہمیدہ است
شِرک را در خوف مضمر دیدہ است''(۳۷)

اقبال نے اس مثنوی میں امّت مسلمہ کے لیے حکایتوں کے ذریعے ان میں توحید کی روح کو مزید محکم اور استوار کیا ہے اور اس کے بعد ملّتِ اسلامیہ کے دوسرے اہم اساسی پہلو ''رسالت'' کی برکتوں کا بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارا پیکر پیدا کیا، پھر رسالت سے ہمارے اس وجود میں روح پھونکی۔ رسالت ہی سے دنیا میں ہماری آفرینش ہوئی اور رسالت ہی سے ہمارا دین وآئین ہے۔ ہم اس (رسالت) کے تعلق ہی کی بنا پر ایک ملّت ہیں اور ہم اہلِ جہاں کے لیے رحمت کا پیغام ہیں۔ دینِ فطرت یعنی اسلام حضور نبی اکرم ﷺ کی وساطت سے ہم تک پہنچا ہے۔ اس طرح ہم نے راہِ حق میں ایک مشعل روشن کردی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر شریعت اور ہمارے رسولِ اکرم ﷺ پر رسالت کا خاتمہ کردیا۔ ہمارے ہی دم سے بزمِ زمانہ کی رونقیں قائم ہیں۔ حضورؐ پر نبوّت ختم ہوگئی اور ملّتوں کا سلسلہ ہم پر ختم ہوگیا۔

''حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید
وز رسالت در تنِ ما جان دمید''
''از رسالت در جہان تکوینِ ما
از رسالت دینِ ما آئینِ ما''
''حلقۂ ملّت محیط افزاستی
مرکزِ او وادیِ بطحاستی''
''ما ز حکمِ نسبتِ او ملّتیم
اہلِ عالم را پیامِ رحمتیم''
''دینِ فطرت از نبیؐ آموختیم
در رہِ حق شعلہ¬ای افروختیم''
''پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِؐ ما رسالت ختم کرد''

''رونق از ما محفلِ ایّام را
اُو رَسُل را ختم، ما اقوام را''(۳۸)

اقبال نے نہایت مؤثر انداز میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ رسالتِ محمدیہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ معاشرے میں حرّیت و مساوات اور اخوّت کی قدروں کو فروغ دے کر بنی نوع انسان کی فلاحِ ذہنی اور سکونِ روحانی کا سامان پیدا کرے۔ اسی کے لیے ملّت کو ایثار و قربانیوں کی منازل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس بات کو مزید صراحت سے بیان کرنے کے لیے اقبال نے حکایتوں کا سہارا لیا ہے جیسے ''حکایتِ بوعبیدہ و جابان''، ''حکایتِ سلطان مُراد و معمار'' اور ''سِرِّ حادثۂ کربلا''۔ یہ بات واضح کی گئی ہے کہ چوں کہ ملّتِ اسلامیہ کی اساس توحید و رسالت کے لافانی و ابدی اصولوں پر رکھی گئی ہے اس لیے وہ زمان و مکان کی حد بندیوں سے ماورا ہے۔ ملّتِ اسلامیہ کی اساس نسل اور وطن نہیں بلکہ آئین پر ہے جس کا دوسرا نام ''قرآن'' ہے۔ یہ کتابِ الٰہی، ملّتِ اسلامیہ کے لیے مستقل رہنما اصول لے کر آئی ہے۔ اس کا دیا ہوا نظامِ حیات جامد نہیں لچک دار ہے۔ اقبال نے تقلید اور اتّباع کرنے کی تائید اور اس پر عمل پیرا ہونے پر زور دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''آن کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ او لایزال است و قدیم''
''نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات
بی ثبات از قوّتش گیرد ثبات''
''نقش بر دل معنیِ توحید کن
چارۂ کارِ خود از تقلید کن''
''از یک آئینی مسلمان زندہ است
پیکرِ ملّت ز قرآن زندہ است''
''ملّت از آئینِ حق گیرد نظام
از نظامِ محکمی خیزد دوام''(۳۹)

(ترجمہ: وہ زندہ و جاوید کتاب قرآن حکیم ہے جس کی حکمت لازوال اور قدیم ہے۔ وہ قرآنِ حکیم زندگی کی تکوین (وجود میں آنے) کے رازوں کی کتاب ہے۔ اس کی قوت سے ناپائیدار (فانی) بھی پائیداری (بقا) حاصل کر لیتا ہے۔ تو اپنے دل پر توحید کے معنی نقش کر دے اور اپنے معاملات کی چارہ جوئی تقلید سے کر۔ مسلمان ایک ہی آئین سے وابستہ ہو کر زندہ ہے اور ملّت کا ڈھانچہ قرآن سے زندہ ہے۔ ملّت اسلامیہ آئینِ حق سے نظم و نسق حاصل کرتی ہے اور ایک محکم اور مضبوط نظام سے ہی دوام حاصل ہوتا ہے۔)

اس مثنوی کے آخر میں خلاصۂ مطالب مثنوی کے عنوان، سورۂ اخلاص کی منظوم تفسیر اور آنحضرتؐ کی شان میں نعتیہ اشعار بہ طرز مناجات ہیں۔

اسرار و رموز کے مطالعے سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ اقبال کا فلسفۂ حیات جسے انھوں نے خودی اور بیخودی کا نام دیا ہے بنیادی طور پر قرآن اور رسالت سے ماخوذ ہے۔ اطاعتِ الٰہی، ضبطِ نفس، تخلیقِ مقاصد اور مقاصد کے حصول کے لیے سعی پیہم پر اس فلسفۂ حیات کی اساس ہے اور اس کا لُب لباب یہ ہے کہ قوّت کے بغیر فرد اور ملّت دونوں کی زندگیاں بے معنی ہیں۔

خودداری، غیرت مندی اور عزت کے ساتھ زندہ رہنے اور دوسروں کو اس کا حق دینے اور دلانے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے خود قوّت حاصل کی جائے اور قوّت کا سرچشمہ خودی ہے اور اس کا رہنما عشق ہے۔

اقبال خود ایک مسلمانِ صادق تھے اور انھیں ملّت مسلمہ کا بیحد خیال تھا۔ وہ مغربی اثر و رسوخ اخذ کرنے پر ہر وقت مسلمانوں کو آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ ان کی نظر میں مغرب کا انحصار ملک و نسب پر ہے جبکہ مسلمانوں کو ان کی مذہبی قوّت مستحکم کرتی ہے۔ اس حوالے سے وہ نظم ''مذہب'' میں کہتے ہیں:

''اپنی ملّت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی''
''ان کی جمعیّت کا ہے مُلک و نَسب پر اختیار
قوّتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیّت تری''
''دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیّت کہاں
اور جمعیّت ہوئی رخصت تو ملّت بھی گئی''(۴۰)

اقبال مثنوی مسافر میں دین کی وضاحت بڑے دلکش پیرائے میں کرتے ہیں کہ دین در واقع اپنے اسرار کی تلاش ہے اور خود کو تلاش کیے بغیر زندہ رہنا موت کے برابر ہے۔ بندگانِ حق پیغمبروں کے وارث ہیں اور اس لیے وہ دوسروں کی دنیا میں نہیں رہ سکتے۔ زندہ شخص غیر اللہ سے دوری چاہے گا اور خودی اور خودشناسی سے اس کا وجود چراغ کی مانند روشن و تاباں ہے وہ کہتے ہیں:

''چیست دین؟ دریافتن اسرارِ خویش
زندگی مرگ است بی دیدارِ خویش''
''بندۂ حق وارثِ پیغمبران
او نگنجد در جہانِ دیگران''

''زندہ مرد از غیرِ حق دارد فراغ
از خودی اندر وجودِ او چراغ''(۴۱)

ترجمہ: (دین کیا ہے؟ اپنے اسرار جاننا۔ اپنے آپ کو دیکھے بغیر زندگی موت ہے۔ اللہ کا بندہ پیغمبروں کا وارث ہے اور وہ دوسروں کی دنیا میں نہیں سما سکتا۔ زندہ شخص غیر اللہ سے آسودہ ہے۔ اس کی خودی سے اس کا وجود روشن ہے۔)

اقبال کو فرنگی تہذیب سے سخت نفرت تھی اور وہ اسے اپنی قوم کے لیے زہر قاتل سمجھتے تھے۔ اس لیے نظم ''ایک نوجوان کے نام'' میں وہ اپنے شاہینوں کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کرتے رہے اور ان کی تربیت کرتے رہے۔ وہ تہذیبِ حاضر سے مستغنی ہو کر اپنی تہذیب میں رہتے ہوئے جدّوجہد کی تاکید فرماتے رہے۔ وہ کہتے ہیں:

''ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رُلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی''
''نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلّی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ سلیمانی''(۴۲)

اقبال، نوجوانوں کو نومیدی کے نقصانات سے آگاہ کرتے ہیں اور انھیں قصرِ سلطانی سے دور پہاڑوں کی چٹانوں پر بسیرا کرنے کی تلقین کرتے ہیں کیوں کہ شاہین کی پرواز اونچی ہوتی ہے اور وہ اونچے مقام پر رہنا پسند کرتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں''
''نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں''(۴۳)

خودی، فقر اور عشق جس شخص میں جمع ہوں گے وہ اقبال کی اصطلاح میں مومن کہلائے گا۔ اقبال کے اردو یا فارسی اشعار کو پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ وہ ہر لمحہ اپنے ہم وطنوں اور مستقبل کے معماروں کی دینی، اخلاقی اور روحانی اصلاح اور کردار سازی میں کوشاں ہیں۔ وہ اس مردِ مومن کو غفلت کی تباہ کاریوں سے آگاہ اور ان کی عقل و خرد پر پڑے پردے ہٹانے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ زبورِ عجم کی نظم ''از خواب گران خیز'' میں اقبال مردِ مومن سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تو ناموسِ اَزل کا امین ہے۔ تو خدا کا یمین و یسار (مددگار) ہے۔ اے خاکی بندے تو زمانی اور زمینی ہے، یقین کی شراب پی اور دَیرِ گمان سے اٹھ:

''ناموسِ اَزل را تو امینی تو امینی
دارای جہان را تو یساری تو یمینی''

''اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی
صہبای یقین دَرکش و از دیرِ گمان خیز''
''از خواب گران خواب گران خواب گران خیز''
''از خواب گران خیز!''(۴۴)

دخترانِ ملّت کی تربیت اور کردار سازی

''جس طرح اقبال نے اپنے اشعار اور افکار سے بچّوں اور نوجوانوں کی تربیت اور ان کی کردار سازی میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے اسی طرح وہ دخترانِ ملّت کے لیے بھی وہی طرز حیات پسند کرتے ہیں جو قرونِ اولیٰ میں مسلمان خواتین میں پایا جاتا تھا۔''(۴۵)

جس طرح نپولین بونا پارٹ کا یہ مقولہ مشہور ہے کہ ''تم مجھے اچھی مائیں دو میں تمھیں اچھی قوم دوں گا'' اس طرح اقبال بھی دنیا کی استقامّت کی اصل 'ماں' کو قرار دیتے ہیں۔ مائیں ''امینِ ممکنات'' ہیں۔ جو قومیں ماؤں کی قدر نہیں کرتیں ان کا نظامِ زندگی سنبھل نہیں سکتا۔

''جہان را محکمی از اُمہات است
نہادِ شان امینِ ممکنات است''
''اگر این نکتہ را قومی نداند
نظامِ کاروبارش بی ثبات است''(۴۶)

اقبال مسلمان خاتون کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تیری فطرت بلند جذبوں کی حامل ہے۔ تو اپنی عقل کی آنکھ اُسوۂ حضرت فاطمہ الزہرا سلام اللہ علیہا سے مت چُرا تا کہ اولاد کی پرورش اور تربیت کے سلسلے میں تو حُسین سا کوئی پھل، آنے والے موسم (یعنی زمانے) میں لا سکے، وہ کہتے ہیں:

''فطرت تو جذبہ ھا دارد بلند
چشمِ ہوش از اُسوۂ زہرا مبند''
''تا حُسینی شاخِ تو بار آورد
موسمِ پیشین بہ گلزار آورد''(۴۷)

علامہ اقبال حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی ذاتِ اقدس کو ملّتِ اسلامیہ کی خواتین کے لیے مثالی خاتون سمجھتے ہیں اور جگہ جگہ ان کے اتّباع کی تاکید کرتے ہیں۔ بتول حضرت فاطمہ کا لقب ہے جس کے معنی ہیں: پاک و طاہر، بتول لغت

میں اس عورت کو کہا جاتا ہے جس نے دنیا اور اس کے لذات سے لاتعلقی اختیار کر کے صرف خدا سے لو لگائی ہو۔

اقبال حضرت بتول علیہا سلام کو ''حاصلِ مزرعِ تسلیم'' اور ان کی شخصیت کو ماؤں کے لیے مکمل نمونہ سمجھتے ہیں۔ حضرت زہرا صبر و رضا کی ادب پروردہ تھیں۔ چکی چلاتیں اور اس حالت میں بھی اُن کے مبارک ہونٹوں پر قرآن کریم جاری ہوتا:

''مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؑ
مادران را اُسوۂ کامل بتولؑ''
''آن ادب پروردۂ صبر و رضا
آسیا گردان و لب قرآن سرا''(۴۸)

''اقبال ایسی بلند مرتبت خاتون کو طبقۂ نسواں کے لیے سراپا تقلید بنانے کے خواہاں تھے تاکہ مسلم خواتین میں حوصلہ و ہمت، بہادری و جرأت، استغنا و عبادت اور تقدّس و صفا کے عناصر پیدا ہو سکیں۔'' (۴۹)

اقبال ارمغانِ حجاز کی ایک دو بیتی میں دخترانِ ملّت کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اگر پندی ز درویشی پذیری
ھزار امّت بمیرد، تو نمیری''
''بتولی باش و پنھان شو ازین عصر
کہ در آغوش، شبیری بگیری''(۵۰)

(ترجمہ: تو اگر اس درویش (اقبال) کی نصیحت قبول کرے تو ہزار ماؤں میں تجھے دوام حاصل ہو جائے گا۔ نصیحت یہ ہے کہ بتول کی سی زندگی گزار اور اس زمانے کی نظروں سے پنہاں رہ تاکہ تیری آغوش میں شبیرؑ جیسے فرزند تربیت پائیں۔)

اقبال نے اپنے کلام میں مختلف مسلم خواتین کا ذکر کیا ہے جیسے شرف النساء بیگم جو مغلیہ دور میں پنجاب کے صوبے دار نواب عبدالصمد خان کی دختر تھی اور اس نے ساری زندگی قرآن اور تلوار سے محبّت کا ثبوت دیا۔ جاوید نامہ ہی میں قرۃ العین طاہرہ بابیہ کا کردار پیش کیا جو محمد علی شیرازی کے باب اللہ کے دعوے سے متاثر ہوئی اور اپنے عزیز و اقارب کی شدید مخالفت کے باوجود اس کی معتقد ہوئی۔ بابیوں نے اسی کے باپ کو قتل کرا دیا تو وہ فرار ہو کر باب کے پاس خراسان پہنچ گئی جس نے اسے قرۃ العین کا لقب دیا۔

خود اقبال نے اپنی والدہ کا کردار خواتین کے لیے عمدہ نمونہ پیش کیا۔ ان کا نام امام بی بی تھا۔ اس کے علاوہ فاطمہ بنت عبداللہ جو جنگ میں قیدیوں کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہوئی۔

اقبال کے ہاں یہ تمام عورتیں افرادِ ملّت میں تربیت و تہذیب، مذہب و ثقافت، علم و ذہانت، تحرک و دیانت، جذبہ

حرّیت اور مقصدیت جیسے اوصاف عالیہ پیدا کرنے کے محرک کے طور پر متعارف ہوئی ہیں۔

خلاصہ

علامہ محمد اقبال بیسویں صدی کے ایک عظیم مفکر، شخصیت ساز معلم اور ملّتِ اسلامیہ کے ایک جاں سوز رہبر ہیں۔ انھوں نے اردو اور فارسی کلام کے ذریعے معاشرے کی تربیت اور ان کی اخلاقی اور روحانی اصلاح کی ہے۔ ان کی نثر ہو کہ نظم اس میں زندگی کے کسی نہ کسی پہلو پر پند و اندرز ملتّا ہے۔ وہ سعدی شیرازی کی طرح معلم اخلاق اور مولانا رومی کی طرح انسان اور معاشرے دونوں کی تعمیر و تشکیل کے خواہاں ہیں۔ وہ نوجوانوں کی تربیت کے لیے مثالی شخصیتوں کا وجود اور ان کا ذکر بے حد ضروری سمجھتے ہیں، اسی لیے ان شخصیات کا ذکر جا بہ جا اپنے اشعار میں لائے ہیں۔ ان کے نزدیک فرد کی ذات اور کائنات میں مسلسل ارتقا کا عمل جاری رہتا ہے اور تربیت، تعمیرِ شخصیت اور کردار سازی کے لیے مثالی شخصیتوں کا وجود لازمی ہے۔ ایک انسان جب اپنے معبود سے اپنا رابطہ مضبوط رکھتا ہے تو اس کی تمام تر توانائیوں کو خاص قوت ملتّی ہے جو اسے اپنی منزل کی طرف بڑھنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ قوت عمل پیرا ہونے کا باعث ہے اور عمل پیہم ہی بالآخر انسان کی تقدیر ٹھہرتا ہے جو جذبۂ جستجو کے ساتھ مملو ہے۔ عمل سے کردار بنتا ہے اور کردار کے کندن بننے کے اس عمل کے نتیجے میں انسانی شخصیت سخت کوش، خارا شگاف، بے خوف، عقابی روح رکھنے والی، بے باک، فولاد مزاج، سخت گیری اور دلبری کی صفات سے متصف ہو کر ابھرتی ہے۔ افکارِ اقبال کے مخاطب عام طور پر نوجوان ہیں۔ اس لیے قومی تشخص کی تشکیل میں اقبال نے اپنے افکار میں تربیت کو ہر جگہ ترجیح دی ہے۔

''گمان مبر کہ بہ پایان رسید کار مغان''
''ھزار بادہ نا خوردہ در رگ تاک است''(۵۱)

حواشی

۱۔ سمیع اللہ قریشی، موضوعات فکر اقبال، (لاہور، اقبال اکیڈمی، طبع اول، ۱۹۹۶)، ص ۲۱
۲۔ (https://erfan.ir/urdu/28478.html#)، ۲۱ جولائی، ۲۰۲۳ء
۳۔ فرمان فتح پوری، اقبال سب کے لیے، (کراچی: شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونی ورسٹی، ۱۹۹۹ء)، ص ۱۰۳، طبع ثانی
۴۔ محمد احمد صدیقی، اقبال کا فلسفۂ تعلیم، (کراچی: کراچی بک کمپنی، ۲۰۰۰ء)، ص ۸۔۹
۵۔ فرمان فتح پوری، ص ۱۰۴۔۱۰۵
۶۔ ہارون الرشید تبسم، اقبالیات بچوں کے لیے، (فیصل آباد: مثال پبلشرز، اگست ۲۰۱۸ء)، ص ۱۱
۷۔ ایضاً، ص ۲۱۔۲۲
۸۔ صائب تبریزی، دیوان صائب، (کراچی: نیشنل پبلک ہاؤس لمیٹڈ، ۱۹۷۱ء)، ص ۲۸۶

۹۔ حمیرا شہباز، جایگاہ اقبال لاہوری در ادبیات کودک و نوجوان مشمولہ پژواک، شمارہ ۱، سالنامہ علمی پژوھشی، گروہ زبان و ادبیات فارسی، دانشگاہ کراچی، ۲۰۱۶ء، ص ۱۱۶

۱۰۔ اقبال، کلیات اقبال اردو، (لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۶ء)، ص ۵۹۔۶۰، طبع ہفتم

۱۱۔ اقبال، کلیات اقبال اردو، بانگ درا، ص ۶۲

۱۲۔ ایضاً، ص ۶۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۶۶

۱۴۔ ایضاً، ص ۶۹

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۱۸۔۱۱۹

۱۶۔ ایضاً، ص ۶۵۔۶۶

۱۷۔ حمیرا شہباز، ص ۱۱۶

۱۸۔ اقبال، کلیات اقبال اردو، بانگ درا، ص ۲۰۷

۱۹۔ ایضاً

۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ سیّد قاسم محمود، پیام اقبال بنام نوجوانانِ ملّت، (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۶ء)، ص ۵۹، طبع چہارم

۲۲۔ اقبال، کلیات اقبال، فارسی، مثنوی اسرار خودی، ص ۱۲۔۱۳

۲۳۔ ایضاً، ۱۵۔۱۶

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۶

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۸

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۸۔۱۹

۲۷۔ ایضاً، ص ۲۵

۲۸۔ ایضاً، ص ۴۱

۲۹۔ ایضاً، ص ۴۲

۳۰۔ ایضاً، ص ۴۴

۳۱۔ ایضاً، ص ۵۳

۳۲۔ ایضاً، ص ۷۶۔۷۷۔۷۸

۳۳۔ اقبال، کلیات اقبال اردو، بانگ درا، ص ۲۱۷

۳۴۔ اقبال، کلیات اقبال، فارسی، رموز بیخودی، ص ۸۵۔۸۶

۳۵۔ ایضاً، ص ۹۰

۳۶۔ ایضاً، ص ۹۵۔۹۶

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۰۱۔۱۰۲

۳۸۔ ایضاً، ص ۱۲۱، ۱۲۵، ۱۲۶

۳۹۔ اقبال، کلیات اقبال اردو، بانگ درا، ص ۲۷۷
۴۰۔ اقبال، کلیات اقبال، فارسی، مثنوی مسافر)، ۸۵۴
۴۱۔ (اقبال، کلیات اقبال، اردو، بال جبریل)، ۴۴۷
۴۲۔ ایضاً، ص ۴۴۷۔۴۴۸
۴۳۔ (اقبال، کلیات اقبال، فارسی، زبور عجم)، ۴۷۵
۴۴۔ ایضاً، ۹۴
۴۵۔ اقبال، کلیات اقبال، فارسی، ارمغان حجاز، ص ۹۷۵
۴۶۔ ایضاً، مثنوی بیخودی، ص ۱۵۵
۴۷۔ ایضاً، ص ۱۵۳
۴۸۔ ایضاً، ۲۲۳
۴۹۔ بصیرہ عنبرین، اقبال، وجود زن اور تصویر کائنات، (لاہور: دارالنوادر، ۲۰۱۹ء)، ص ۹۵
۵۰۔ اقبال، کلیات اقبال، فارسی، ارمغان حجاز، ص ۹۷۶
۵۱۔ ایضاً، پیام مشرق، افکار، ص ۲۶۴

مآخذ:

۱۔ اقبال، کلیات اقبال اردو، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۶ء، طبع ہفتم
۲۔ تبریزی، صائب، دیوان صائب، کراچی: نیشنل پبلک ہاؤ لمیٹڈ، ۱۹۷۱ء
۳۔ تبسم، ہارون الرشید، اقبالیات بچوں کے لیے، فیصل آباد: مثال پبلشرز، اگست ۲۰۱۸ء
۴۔ صدیقی، محمد احمد، اقبال کا فلسفۂ تعلیم، کراچی: کراچی بک کمپنی، ۲۰۰۰ء
۵۔ عنبرین، بصیرہ، اقبال، وجود زن اور تصویر کائنات، لاہور: دارالنوادر، ۲۰۱۹ء
۶۔ فتح پوری، فرمان، اقبال سب کے لیے، کراچی: شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونی ورسٹی، ۱۹۹۹ء، طبع ثانی
۷۔ قریشی، سمیع اللہ، موضوعات فکر اقبال، لاہور، اقبال اکیڈمی، طبع اول، ۱۹۹۶ء
۸۔ محمود، قاسم، سیّد، پیام اقبال بنام نوجوانانِ ملّت، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۶ء، طبع چہارم

رسائل:

۱۔ پژواک، شمارہ ۱، سالنامہ علمی پژوھشی، گروہ زبان و ادبیات فارسی، دانشگاہ کراچی، ۲۰۱۶ء

ویب گاہ:

1. https://erfan.ir/urdu/28478.html#